ایک درس مکتب اسلام سے

آقائے شریعت صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

اعتراض

کہا جاسکتا ہے کہ اگر یہ مان لیں کہ پوری دنیا ایک اشارۂ کن سے عالم وجود میں آ گئی تب تو یہ مانا جاسکتا ہے کہ نظم وترتیب کا پایا جانا خالق کے حکیم وعلیم ہونے کی دلیل ہے۔ مگر ڈارون اور ان کے ہم خیال فلاسفہ کا نظریۂ جدلیت قبول کرنے کے نتیجہ میں موجودہ نظم وضبط کا پایا جانا خالق علیم وحکیم کے وجود کی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس نظریہ کے مطابق ناقص چیزیں فنا ہوتی رہتی ہیں۔ بہتر اور کامل چیزیں باقی رہ جاتی ہیں اور چونکہ ہمارے پیش نظر ایسی کامل چیزیں ہیں لہٰذا ہمیں حکمتیں اور مصلحتیں نظر آتی ہیں ورنہ کائنات میں غلط اور ناقص چیزیں بھی تھیں۔

جواب

ڈارون کے نظریہ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس نظریہ کا نتیجہ بہتر اور کامل تر کی بقاء نہیں بلکہ اس چیز کی بقاء ہے جس کے لئے ماحول سازگار ہو۔ وہی چیزیں باقی رہتی ہیں جو اپنے ماحول سے مناسبت رکھتی ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ماحول ناقص اشیاء کے لئے سازگار ہوتو ناقص اشیاء کو باقی رہنا چاہیے اور اگر کامل شے کے لئے سازگار ہوتو اسے باقی رہنا چاہیے۔ پھر اس اصول کو کس نے جاری کیا کہ کائنات میں وہی چیزیں رہنا چاہئیں جو کامل ہوں اور ناقص فنا ہوجائیں۔ کیا اس کے لئے کسی حکیم ودانا ذات کا وجود ضروری نہیں ہے؟ جس کا کمال مطلق یہ چاہتا ہو کہ کامل باقی رہے۔

کہا جاتا ہے کہ بدشکل اور بدبودار پھولوں کے کم ہونے اور خوشبودار اور خوشنما پھولوں کے بڑھنے کا سبب یہ ہے کہ پرندے اور مکھیاں جو درختوں کے ریزوں کے منتقل کرنے کا سبب ہوتی ہیں وہ خوش رنگ اور خوشبودار پودوں کو ہی پسند کرتی ہیں سوال یہ ہے کہ ان بے زبانوں کی فطرت میں یہ حسن وجمال کی طرف میلان کس نے دیا۔

ڈارون کے فلسفہ کا ایک جزیہ بھی ہے کہ ترقی کا یہ سفر غیر محسوس طریقہ سے لاکھوں برس کی مدت میں رفتہ رفتہ ہوتا ہے مگر موجودات میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن میں اس طرح کے رفتہ رفتہ تغیر کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کہہ لیجئے کہ ابتدائی ذی روح جو قوت سماعت وبصارت سے خالی تھی۔ جب اس میں قوت سماعت وبصارت پیدا ہوئی تو چوں کہ ماحول ان طاقتوں کا سازگار تھا لہٰذا باقی رہ گئی۔

سوال یہ ہے کہ سماعت وبصارت کا وہ پیچیدہ نظام جسے دیکھ کر آج بھی عقل انسانی حیران ہے، رفتہ رفتہ لاکھوں برسوں کے تغیر سے پیدا ہوا یا ایک دم سے اگر ایک دم ہو گیا تو اس کی حکمتیں خالق علیم وحکیم کی خبر دیتی ہیں اور اگر رفتہ رفتہ ہوا تو ابتدائی دور میں جب اعصاب نے اس قول کو حاصل کرنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا تھا اس وقت نہ تو ذی روح کو سماعت

حاصل ہوئی تھی نہ بصارت کیونکہ یہ تو لاکھوں برس بعد آئی ۔ اور اس مرحلے پر ماحول بھی اس کا سازگار نہ تھا اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ تھا۔ لہٰذا استعمال بھی نہ تھا اور ڈارون کے مطابق جو شئے بے فائدہ ہو وہ ختم ہونی چاہئے اور جب پہلا قدم بھی بے فائدہ اور نا قابل سماعت ہونے کی وجہ سے باقی نہ رہے گا تو ترقی کا وہ آخری زینہ جواب قوت سماعت و بصارت کی شکل میں ہے کیسے حاصل ہوگا؟ ماننا پڑے گا کہ یہ طاقتیں ایک دم سے ظہور پذیر ہوئیں اور کوئی علم و دانائی رکھنے والی ذات تھی جس نے ذی حیات کی ضرورت کو دیکھ کر یہ طاقت عطا فرمائی۔

ذی روح کا وجود

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ذی حیات کی ابتدا ذی حیات سے ہوئی، بے جان اور بے روح میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اپنے میں روح اور زندگی پیدا کر سکے ہر ذی حیات کی پیدائش کے لیے کوئی جرثوم ضروری ہے جو خود ذی حیات ہو۔ اگر یہ جرثوم نباتات سے متعلق ہے تو اس سے نباتات پیدا ہوں گے حیوانات سے تعلق رکھتا ہے تو حیوان اور انسان سے تعلق رکھتا ہے تو انسان پیدا ہوں گے۔

بہت سے جرثوم مناسب ماحول نہ ملنے کی وجہ سے ساکت و جامد رہتے ہیں اور مناسب ماحول ملنے پر نمو حاصل کر کے درخت یا جاندار کی شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں ۔ یہ کیڑے مکوڑے، حشرات الارض جو بارش کے ایک چھینٹے سے خود بخود ابل آتے ہیں ان کے جرثومے مٹی میں مسلے ہوئے ہوتے ہیں جو سازگار ماحول ملتے ہی نشوونما حاصل کر کے ظاہر ہو گئے حیات شناس علماء کا یہ مسلمہ نظریہ ہے۔ یہ بھی مسلمہ ہے کہ جرثوم کی حیات کے لیے ایک مخصوص حرارت کی ضرورت ہے اگر حدت ۲۰۰ ڈگری تک پہنچ جائے تو کسی جرثوم کی بقاء قطعاً ممکن نہیں۔

زمین کے متعلق موجودہ نظریہ یہ ہے کہ یہ آفتاب سے جدا شدہ ایک ٹکڑا ہے جس کی حرارت ابتدا میں وہی تھی جو آفتاب کی ہے ۔ رفتہ رفتہ اس کی اوپری پرت ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی اور ایک مدت کے بعد اس قابل ہوئی کہ کوئی جاندار اس پر باقی رہ سکے ۔ آفتاب کا درجہ حرارت ۱۱ر ہزار فارن ہائیٹ ہے اس لیے زمین کا بھی یہی رہا ہوگا لہٰذا کسی جاندار کا اتنی شدید حرارت میں پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے اور آج جو ہزاروں قسم کے جاندار سطح زمین پر پائے جاتے ہیں وہ اس وقت نہ ہوں گے تو پھر زمین پر زندگی کیسے آئی؟ ماننا پڑے گا کہ ایک باارادہ و بااختیار خالق ہے جو اپنے ارادے سے (جس کی تعبیر قرآن میں قل الروح من امر ربی کہہ کر لفظ امر سے کی گئی) بے جان چیز میں جان ڈال سکتا ہے۔

یہ تو سب مانتے ہیں کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے تخلیق کائنات سے قبل جامد و ساکت ستارے کا وجود مانا جائے اور کہا جائے کہ اس میں کسی اچانک حادثہ کی بنا پر حرکت پیدا ہوئی اور کہکشاؤں کی تشکیل شروع ہوگئی لیکن اس کا جواب کیا ہے کہ ساکت و جامد مادہ میں اچانک حرکت آئی کیونکر اور وہ دھماکہ کیوں ہوا جس نے ساکن کائنات کو حرکت میں بدل دیا اس منزل پر عقل سرگشتہ ہوئی تو مذہب کا سہارا لینا پڑا اور تسلیم کرنا پڑا کہ ہر مادے سے ماورا بھی کوئی طاقت ہے جس نے اسے حرکت دی اور تخلیق کا چکر چلایا۔ زمین پر لڑھکتے ہوئے پہئے کو دیکھ کر ہم اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کوئی ہاتھ تھا جس نے اسے

حرکت دی تھی چاہے وہ ہاتھ ہمیں نظر بھی نہ آ رہا ہو۔ انسان کے بنائے ہوئے درجنوں خلائی جہاز خلا میں چکر لگا رہے ہیں جن میں کوئی ڈرائیور نہیں۔ تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمیشہ سے یونہی خود بخود حرکت میں مشغول ہیں! نہیں بلکہ مانتے ہیں کہ ایک حرکت دینے والی طاقت نے انہیں خلا میں پہنچا کر ایک معینہ مدار پر گردش دے دی اس طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے ایک ایسا پر قوت ہاتھ موجود ہے جس نے اس کائنات کو تمام کہکشاؤں کے ساتھ حرکت میں دیا ہے اور تخلیق کے راستے پر ڈالا ہے اسی لیے تو قرآن نے کہا کہ ان الی ربک المنتھی کسی راستہ سے جاؤ انتہا تمہارے رب پر ہی ہوگی۔

صفات خدا اور فطرت

اللہ تک پہنچنے کے لیے بہترین وسیلہ انسان کی فطرت اور اس کا وجدان ہے فلسفیانہ موشگافیاں، علماء کی دلیلیں ہمارے فہم سے بالاتر ہو سکتی ہیں مگر فطرت کی رہنمائی ہر عالم و عامی کے ساتھ ہے کسی چرخہ چلانے والی عورت سے خدا کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ ہاتھ روک کر کہتی ہے کہ یہ معمولی سا چرخہ جب میں چلاتی ہوں تو چلتا ہے اور ہاتھ روک دیتی ہوں تو رک جاتا ہے تو کارخانۂ عالم بغیر کسی چلانے والے کے کیسے چل سکتا ہے۔ عرب کا بدو یہ کہتا ہے کہ میں ریگستان میں مینگنیاں دیکھ کر اندازہ لگا لیتا ہوں کہ کوئی اونٹ گزرا ہے تو پھر یہ شمس و قمر یہ زمین اور آسمان اور ہر طرف علم و حکمت کے آثار کیا کسی لطیف وجود کا پتہ نہیں دیتے۔

یہی فطرت ان قبائل کو جو تہذیب سے ناآشنا دوسرے انسانوں سے الگ تھلگ اور جنگلوں اور پہاڑوں تک محدود تھے بتا رہی تھی کہ تم چاہے کچھ نہ جانتے ہو یا کسی نبی یا رسول کی آواز تم تک نہ پہنچی ہو مگر میں بتاتی ہوں کہ یہ کائنات، یہ چاند ستارے، یہ زمین و آسمان بغیر کسی صاحب ارادہ و اختیار کے خود بخود عالم وجود میں نہیں آئے، فطرت نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ ایسی ہستی کے سامنے سر جھکا دیں اور اسے اپنی تمناؤں کا مرکز قرار دیں اور اس کا مظاہرہ بھی اس دور کے فنکاروں کی بنائی ہوئی مورتیوں سے ہوتا ہے۔ جنہیں ان کی نارسیدہ عقل اور ناپختہ ذہن نے اپنے معبود کی صفات کا مظہر قرار دیا تھا یا ان دعاؤں، مناجاتوں اور مدحیہ نظموں سے اندازہ ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے ان کے ادبی ذوق اور شاعرانہ ذہن رکھنے والے افراد اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قدیم ترین ادب کے جن شہ پاروں تک ہم پہنچ سکے ہیں ان کا زیادہ تعلق اسی قسم کے مذہبی ادب سے ہے چاہے مورتیوں کے ذریعہ سے جذبات محبت و عقیدت کا اظہار ہو یا نظم و نثر میں اس کا مظاہرہ ہوا ہو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسانی فطرت جہاں خالق کے وجود کی طرف رہنمائی کرتی ہے وہیں اس کے صفات علم و قدرت، سمیع و بصیر، رحمانیت و رحیمیت اور جباریت و قہاریت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے مورتیوں کو کبھی اس کے حسن و جمال کا مظہر قرار دے کر بتایا کہ وہ مرکز کمالات ہے اور کبھی ان کی شکل میں رحمانیت اور کبھی قہاریت کا اظہار کیا۔ تمناؤں اور دعاؤں کے ذریعہ بتایا کہ وہ سمیع و بصیر ہے، علم و قدرت رکھتا ہے، مخلوق پر مہربان ہے ورنہ دعاؤں سے کیا حاصل ہے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ فطرت صرف اشارہ کرتی ہے اس کی ہدایت اجمالی ہے اسی لیے فطرت کے اشاروں کو سمجھنے اور اجمال کی تفصیل میں غلطی ہوا کرتی ہے

جس کی مثال وہ مولود بچہ ہے جسے فطرت اشارہ کر رہی ہے کہ وہ اپنی غذا کی تلاش میں منہ کھولے اور اس کی صحیح غذا مادر کے پستانوں میں ہے مگر وہ انہیں ابھی نہیں پہچانتا اس لیے اس کے منہ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا یا کسی کی انگلی آجاتی ہے تو وہ پستان مادر کے دھوکے میں اسے چوسنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی پرورش کرنے والے اس کے جذبۂ طلب کی تسکین کے لیے اسے چسنی کا عادی بنا دیتے ہیں جس سے اس کا پیٹ تو نہیں بھرتا مگر غلط عادت کی وجہ سے وہ اسے ڈھونڈھتا ہے اور اس کے بغیر روتا ہے اور بڑے ہونے پر بھی یہ عادت نہیں جاتی ایسے میں خدا کی معرفت کے سلسلہ میں بھی فطرت کے اجمال کی صحیح تفصیل انسان اپنی طفولیت کے دور میں نہ کر سکا، جسے مظہر جلال و جمال سمجھا اس کے آگے سر جھکا لیا بعد میں جب ذہن پختہ ہوا تو اگر چہ یہ سمجھنے لگا کہ جن کی عبادت کر رہا ہے صرف کھلونے ہیں مگر جو عادت پڑ چکی ہوتی ہے اسے چھوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے لہٰذا عقل روکتی رہی مگر عادت سر جھکاتی رہی۔

خدا پر ایمان کے نتائج

فطرت کے اشارے، وجدان کی آواز اور عقل کی رہنمائی کا تقاضا ہے کہ انسان تسلیم کرے کہ کارخانۂ عالم کے کسی مختصر ترین جزو کے سمجھنے سے بھی عقل انسانی قاصر ہے اور بڑے بڑے علماء حیران ہیں۔ بغیر کسی عالم و قادر کے وجود میں نہیں آسکتا مگر ان سب کے اجتماعی فیصلے کو مان لینا صرف ایک حقیقت کو تسلیم کر لینا اور ایک ایسے واقعہ کو مان لینا نہیں ہے جس کا انسان کی زندگی سے کوئی ربط و تعلق نہ ہو، مان لیا تو اچھا کیا نہ مانتا تب بھی کوئی نقصان نہ تھا بلکہ خدا کا اقرار براہ راست انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس طرح فطرت کے ہر تقاضہ اور ہر طلب کو ٹھکرانے کا نتیجہ انسان کے ذہن اور اس کے اعصاب پر پڑتا ہے ایسے خدا پر ایمان لانا اور ایک کامل ذات کو اپنا محبوب قرار دینا، اپنی الجھنوں کو اس کے سامنے پیش کرنا فطرت کا تقاضہ ہے اس کو ٹھکرانے کے نتیجہ میں انسانی زندگی میں ایسا خلا پیدا ہوتا ہے جو کسی چیز سے پر نہیں ہوسکتا ہے۔ وطن پرستی قومیت، نیشنلزم، سوشلزم اور جانے کتنے بت بنا کر خدا کی جگہ بٹھانا اس خلا کو پر نہیں کر سکتا جو اللہ کے عقیدہ کو ہٹانے سے ہوا ہے اس کے نتیجہ میں انسان کا سکون و اطمینان جاتا رہا، مایوسی کے عالم میں اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور یہ مایوسی اس وقت پیدا ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ اب مصیبت سے بچانے والا کوئی نہیں ہے لیکن اگر ایسی قوت پر یقین ہو جس کے قبضۂ اقتدار سے کچھ باہر نہیں تو انسان کبھی مکمل طور پر مایوس نہیں ہوسکتا کیونکہ سب سہارے ٹوٹنے کے بعد بھی ایک سہارا ہے، امید قائم رکھتا ہے اور امید کے باقی رہنے کا مطلب ہے قوت عمل اور مدافعت کا باقی رہنا۔ اگر انسان آخر وقت تک پوری صلاحیتوں کے ساتھ مقابلہ کرتا رہے تو غیبی مدد سے قطع نظر بھی کامیابی کے امکانات قائم رہتے ہیں۔ کتنا صحیح ارشاد ہے قرآن کا: **''فمن یکفر بالطاغوت و یومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لاانفصام لھا''** جس نے ہر طاغوتی طاقت کو ٹھکرا دیا اور اللہ پر یقین اور ایمان پیدا کر لیا اس نے ایسے مضبوط وسیلہ کا سہارا لیا جو ہرگز ہرگز کبھی ٹوٹتا نہیں۔

(جاری)